بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

پاکستان پچھلے چند مہینوں میں جس صورتِ حال سے دوچار رہا ہے، ممکن ہے کہ وہ کسی سطح بین آنکھ کے لیے کوئی اتفاقی حادثہ یا وقتی ہنگامہ آرائی ہو مگر جو لوگ اجتماعی معاملات کی معمولی سمجھ بوجھ بھی رکھتے ہیں ان کے لیے وہ کسی اعتبار سے بھی اَن ہونی بات نہ تھی بلکہ سب کچھ اُس آمریت کا بالکل فطری نتیجہ تھا جو گذشتہ دس سالوں سے اس ملک پر بُری طرح مسلط چلی آرہی تھی۔ فوج کے خوف، پولیس کے تشدد، پریس اور پلیٹ فارم پر قدغن اور آمرانہ قوانین کی جکڑ بندیوں کی وجہ سے اجتماعی زندگی کی سطح پر اس عرصے میں بظاہر سکون دکھائی دیتا تھا لیکن ہر صاحبِ بصیرت انسان سطح کے نیچے پلنے والے ہیجان کو دیکھ کر اس کی تلاطم خیزیوں کا اچھی طرح اندازہ کر رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے یہ چیز قطعاً اوجھل نہ تھی کہ اجتماعی زندگی میں استبداد اور تشدد کے ذریعے پیدا کیا ہوا سکون کبھی دیرپا ثابت نہیں ہوتا بلکہ یہ ہمیشہ کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

اِن اصحابِ فکر و دانش کا ان خدشات کے بارے میں اندازہ کسی لمبی چوڑی تحقیق اور کسی غیر معمولی ذہنی کاوش کا نتیجہ نہ تھا بلکہ نوامیسِ فطرت کی معمولی واقفیت، تاریخ انسانی کا سرسری جائزہ اور روزمرہ کے واقعات کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ اس آنے والے طوفان کی صاف نشاندہی کر رہا تھا۔ جب بے جان اشیاء کو دبانے سے بھی ایک ردِ عمل پیدا ہوتا ہے تو یہ بالکل ناممکن ہے کہ ذی روح اور ذی شعور انسان کو دبانے سے کوئی ردِ عمل رونما نہ ہو۔ جابرانہ اور حاکمانہ حکومت کسی کی زبان پر پہرے بٹھا سکتی ہے، کسی کے قلم پر قدغن لگا سکتی ہے، کسی کی نقل و حرکت پر پابندیاں عائد کر سکتی ہے، مگر اس کے نتیجے میں انسان کے قلب و دماغ کے اندر اضطراب کی جو لہریں اٹھتی ہیں ان پر کوئی تسلط قائم نہیں کر سکتی۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی فرد یا معاشرے پر ظلم ہو رہا ہو تو وہ سنگینوں کی دہشت سے چُپ رہے

اور ظلم کے خلاف زبان سے فریاد نہ کرے، مگر دل کی فریاد کو آخر کیسے روکا جاسکتا ہے ؎

قریب ہے یار و روزِ محشر، چھپے گا کُشتوں کا خون کیونکر
جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

تاریخ کا یہ نہایت واضح اور دو ٹوک فیصلہ زمانے کی لوح پر پوری آب و تاب سے ثبت ہے کہ جب بھی کوئی فرد یا طبقہ زیردست آزاری کو اپنا مشغلہ بناتا ہے اور چالاکی اور عیاری یا جبر و تشدد کے ذریعے عوام کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کرتا ہے تو پھر اس کے زوال کو کوئی بڑی سے بڑی ارضی قوت بھی نہیں روک سکتی۔ انسان جب چند بے جان سکوں سے ناجائز طور پر محروم ہونا گوارا نہیں کرسکتا تو وہ اپنے بنیادی حقوق کو جو درحقیقت اس کی انسانیت کا جوہر ہیں کس طرح تیاگ دینے پر آمادہ ہوسکتا ہے۔ انسان کے خمیر میں ظلم و استبداد کے خلاف نفرت اور ناانصافی اور استحصال کے خلاف غصے کا جذبہ فطری طور پر موجود ہے۔ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے اور واقعات کے پیچھے جھانک کر ان کے اصل محرکات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانیت کی پوری تاریخ ظلم اور ناانصافی کے خلاف طویل جدوجہد کی بڑی عبرتناک داستان ہے۔ جن معاشرتی زلزلوں کو ہم انقلابات کے نام سے موسوم کرتے ہیں ان کی حقیقت آخر اس کے سوا اور کیا ہے کہ ستم زدوں نے ایک مدت دراز تک ستمگروں کے ظلم و ستم سہنے کے بعد آخر کار استبداد کے خلاف آواز بلند کی اور چیخ پکار کر یہ بات ان کے ذہن نشین کرائی کہ خدا نے انہیں آزاد پیدا کیا ہے، انہیں غلام نہ بنایا جائے، قادرِ مطلق نے کائنات کا پورا نظام حق و انصاف کی بنیاد پر قائم کیا ہے اس لیے ان کے ساتھ بے انصافی نہ کی جائے۔ رب العزت نے انہیں اشرف المخلوقات کی حیثیت سے اس کرۂ ارضی پر اتارا ہے، ان کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک نہ کیا جائے۔ انسان محض انسان ہونے کی بنا پر اسی عزت و تکریم کا مستحق ہے جو اس کے مصنوعی آقاؤں نے اپنے لیے مختص کر رکھی ہے۔ مالک الملک نے انسانیت کا تاج کسی مخصوص فرد یا گروہ کے سر پر نہیں رکھا ہے بلکہ سارے انسانوں کو اس سے سرفراز فرمایا ہے۔ اس بنا پر کسی شخص یا طبقے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ انسانوں پر اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ جمائے۔ کبریائی صرف خدائے واحد کو زیب دیتی ہے

انسانی کبریائی کی یوں تو متعدد صورتیں ہیں لیکن اس کی ایک معروف صورت آمریت ہے۔ علمائے سیاست و تاریخ نے اس کی کئی تعریفیں بیان کی ہیں مگر اس کا نہایت صحیح مفہوم "چھوٹی خدائی" کے الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی فرد انسانیت کے دائرے سے نکل کر اپنے آپ کو خدائی کے بلند مقام پر فائز کرنے کی کوشش کرے۔ ضروری نہیں ہے کہ ان غلط خیالات اور عزائم کے ساتھ اقتدار کے تخت پر متمکن ہونے والا شخص نمرود، فرعون اور شداد کی طرح زبان سے بھی خدائی کا دعویدار ہو۔ چھوٹی کبریائی کی شان "خادمِ قوم" ہونے کے زبانی اعلانات کے ساتھ بھی دکھائی جاسکتی ہے۔ اصل چیز دعویٰ نہیں بلکہ وہ اندازِ فکر اور وہ طرزِ عمل ہے جو ایک انسان یا گروہ اولادِ آدم کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔

اس طرزِ فکر اور طرزِ عمل کی سب سے بڑی نمایاں علامت یہ ہے کہ کوئی آدمی اتفاقاً اقتدار پاکر اپنے ذہن میں یہ بات بٹھالے کہ اس کی سوچ ہر عیب سے پاک اور اس کا عمل ہر خامی سے مبرا ہے۔ اسے خالق نے ایک ایسا صحیح اور رسا ذہن عطا کیا ہے جس میں کبھی کوئی غلط بات راہ نہیں پا سکتی۔ اس لیے وہ جو کچھ سوچتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے وہی سو فیصد صحیح و برحق ہے اور لوگوں کے لیے اس کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینے کے سوا کوئی دوسرا طرزِ عمل درست نہیں ہے۔ یہ بنیادی غلطی پھر بہت سی دوسری غلطیوں کو جنم دیتی ہے۔ وہ یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ چونکہ اس سے غلطی کا صدور ممکن نہیں ہے اس لیے کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کی کسی بات پر یا اس کے کسی کام پر حرف گیری کرے۔ جو لوگ اس قسم کی جسارت کرتے ہیں وہ یا تو احمق اور بے وقوف ہیں کہ عقلِ کل شخصیت کے عزائم کی حکمتوں کو سمجھ نہیں پاتے، یا پھر ان کی نیت میں فساد ہے کہ وہ بھلائی اور خیر خواہی کے کاموں میں بلاوجہ کیڑے نکالتے رہتے ہیں۔

اس اندازِ فکر کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پوری قوم کی قوت ایک ہاتھ میں سمٹ کر رہ جاتی ہے اور اجتماعی زندگی کا ڈھانچہ کچھ اس نہج پر تشکیل پاتا ہے کہ بزعمِ خود روشنی کے ایک مینار کے سوا باقی ہر جگہ تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی ہے۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات راسخ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ملک اور قوم کے اندر حق و صداقت، اخلاص اور دردمندی، فہم و تدبر اور انسانی خیر خواہی کا سرچشمہ صرف ایک ذات ستودہ صفات ہے اور اس ایک سرچشمے کے سوا باقی ہر جگہ نفاق، نادانی، اور عاقبت نااندیشی کی غلاظتیں جمع ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عوام نہ صرف ایک

ذات کی طرف دیوانہ وار لپکیں بلکہ جو اس معاملے میں ذرا متامل نظر آئے یا اس فضا میں دانشمندی اور ہوشمندی کی بات کرے اُسے ملک و ملت کا دشمن باور کرایا جائے۔ یہ صورتِ حال پیدا کر کے آمر پوری طرح اس سے فائدہ اٹھاتا ہے اور جن افراد یا گروہوں کو اپنے اقتدار کے لیے کسی لحاظ سے بھی خطرہ سمجھتا ہے انہیں یا تو قوت کے بل بوتے پر ختم کر دیتا ہے یا انہیں عوام کی نظر میں اتنا بے وزن بلکہ ذلیل بنانے کی کوشش کرتا ہے کہ معاشرے میں ان کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔ ان کے خلاف اتنی بدگمانیاں پھیلائی جاتی ہیں کہ وہ بیچارے حکمرانوں کی غلطیوں پر ٹوکنے اور متنبہ کرنے کے بجائے اپنا بیشتر وقت ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے ہی میں صرف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جس طرح بڑ کا درخت وسیع و عریض رقبے کی ساری غذائیت چوس کر اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ برومند کرنے اور پھیلانے کی کوشش کرتا ہے بالکل اسی طرح آمریت پوری قوم اور ملک کی توانائی چوس کر اپنے لیے غیر معمولی قوت کا سامان بہم پہنچاتی ہے اور اس امر کے لیے کوشاں رہتی ہے کہ اس کے اقتدار کا سایہ اتنا پھیل جائے کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ اس کی زد سے محفوظ نہ رہے۔ وقتی آرام اور سکون کے طلبگار اسے ایک نعمت خیال کرتے ہیں مگر سوچنے والے دماغ اور مشاہدہ کرنے والی آنکھ سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہوتا کہ جو درخت زمین کی ساری غذائیت کشید کر کے غیر معمولی قوت و توانائی حاصل کرتا ہے وہ اپنے ارد گرد تو کیا بلکہ دور دور تک کسی دوسرے درخت کو پھلنے پھولنے کے سارے مواقع سے محروم کر دیتا ہے اس بنا پر اس کے قریب سوائے جھاڑ جھنکار کے اور کوئی چیز اُگنے نہیں پاتی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی مشاہدہ میں آئی ہے کہ کوئی درخت غذائیت کے سمیٹنے اور اپنے سائے میں وسعت پیدا کرنے کے معاملے میں جس قدر حریص ہوتا ہے اسی نسبت سے اس کے برباد ہونے کے امکانات بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد ہی اس کی توانائی ختم ہونی شروع ہو جاتی ہے اور اس کے لیے خود اپنا بوجھ اٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی جڑیں اتنی لاغر اور کمزور ہو جاتی ہیں کہ ایک ہلکا سا طوفان اس کے دیو پیکر ڈھانچے کو بڑی آسانی کے ساتھ پیوندِ خاک کر دیتا ہے۔ اُس وقت اس کے سائے میں آرام کرنے والے بے فکرے اور عاقبت نااندیش لوگوں کی آنکھیں کھلتی ہیں اور انہیں دفعتہً اس تلخ حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ چلچلاتی دھوپ سے بچنے کے لیے اب ان کے پاس کوئی دوسرا سہارا باقی نہیں رہا۔

آمریت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اس بڑ کے درخت کی طرح اپنے سامنے کسی متبادل قیادت کو اُبھرنے نہیں دیتی۔ اس کے اردگرد جو لوگ بھی جمع ہوتے ہیں ان کی حیثیت گھاس پھوس سے زیادہ نہیں ہوتی جن کا آمر جس وقت چاہے بڑی آسانی سے استعمال کرسکتا ہے، اور جب بھی وہ ان میں سے کسی کو اکھاڑ پھینکتا ہے تو عوام خس کم جہاں پاک کہکر دل کی گہرائیوں میں ایک گونہ اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ کوئی آنکھ اس کی بربادی پر پُرنم نہیں ہوتی۔

آمریت کو ہروقت اس بات کی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ آمر کی شخصیت کے سوا پورے ملک میں کوئی دوسرا شخص ایسا باقی نہ رہے جس کی طرف لوگ امید اور اعتماد کی نظر سے دیکھیں، جو کبھی عوام کی توجہ کا مرکز بن سکے، اور جس سے لوگ یہ توقع رکھ سکیں کہ وہ بھی ملک کے معاملات کو چلا سکتا ہے۔ چنانچہ نشرواشاعت کے سارے ذرائع لوگوں کے اندر یہ تأثر پھیلانے میں صرف کیے جاتے ہیں کہ قوم اور ملک کا اصل کارساز صرف ایک ہی ہے اور اجتماعی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے جو لوگ بھی اس سے ذرا الگ انداز میں سوچتے ہیں وہ سارے کے سارے نالائق اور خودغرض اور قوم کے لیے خارجی ہیں۔ اس تأثر کو لوگوں کے قلب و دماغ میں اچھی طرح راسخ کرنے کے لیے جہاں ایک طرف آمر کی ہر بات کو بڑی مبالغہ آمیزی اور حاشیہ آرائی کے ساتھ عوام میں اُچھالا جاتا ہے وہاں اس بات کا بھی پوری طرح اہتمام ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا فرد یا گروہ عوام کے اندر اپنا کوئی اثر و رسوخ نہ پیدا کرسکے۔ اس مقصد کے لیے بڑے ذلیل اور اوچھے حربے اختیار کیے جاتے ہیں۔ نشرواشاعت کے سرکاری ذرائع تو خیر برسرِ اقتدار شخصیت کی مدح و توصیف کے لیے وقف ہوتے ہی ہیں، مگر اس کے ساتھ اس بات کا بھی پورا خیال رکھا جاتا ہے کہ کسی ایسے پریس کو پنپنے اور کسی ایسے پلیٹ فارم کو زندہ رہنے کا موقع نہ دیا جائے جو آمر کی ذات کے علاوہ کسی دوسری شخصیت کو نمایاں کرنے کا ذریعہ ثابت ہو۔ اس غرض کے لیے تقریر و تحریر کی آزادی سلب کی جاتی ہے اور سیاسی سرگرمیاں تو ایک طرف رہیں اُن انفرادی سرگرمیوں کو بھی ایک لمحہ کے لیے گوارا نہیں کیا جاتا جنہیں برسرِ اقتدار طبقہ اپنے مفاد کے کسی طرح بھی منافی سمجھتا ہو۔ قوم کو مختلف انداز اور اسلوب کے ساتھ ہمیشہ یہ درس دیا جاتا ہے کہ اگر زبان کھولو تو صاحبِ اقتدار کی ثناخوانی میں کھولو ورنہ خاموش رہو، اگر قلم کو حرکت دو تو صرف اس کی مدح سرائی کے لیے، ورنہ اسے توڑ دو، اگر کوئی سرگرمی جاری رکھو تو اسے صرف اس غرض سے جاری رکھو کہ اقتدار کی قوت اور عظمت میں اضافہ ہو، ورنہ خاموشی کے ساتھ زندگی کے دن بسر کرو۔

معاملہ پروپیگنڈے کے ذریعے صرف "واحد نجات دہندے" کی عظمت کا نقش عوام کے دلوں پر بٹھانے تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اُن سب حضرات کو اجتماعی زندگی کے میدان سے ہٹانے کی کوشش کی جاتی ہے جن کے متعلق یہ معمولی سا شائبہ بھی ہو کہ وہ ملک کے اجتماعی معاملے میں کبھی کوئی مؤثر قوت بن سکتے ہیں۔ اس غرض کے لیے سب سے پہلے ان کمزور افراد کو تلاش کیا جاتا ہے جو دولت و عزت اور منصب و جاہ کے لالچ میں ضمیر کا سودا کرنے پر تیار کیے جا سکیں اور ان لوگوں کو اُن کی مناسب قیمت ادا کر کے اقتدار کی رتھ میں جوت لیا جاتا ہے۔ جن لوگوں کو خوف اور دہشت کے ذریعہ خاموش کرنا ممکن ہوتا ہے ان کے معاملے میں اسی نوعیت کے اخلاق سوز حربے اختیار کیے جاتے ہیں۔ باقی رہے وہ لوگ جنہیں کوئی لالچ اور خوف حق و صداقت کے راستے سے ہٹا نہیں سکتا ان کے خلاف نہایت مکروہ اور گمراہ کن پروپیگنڈا کر کے ان کے مُنہ پر سیاہی ملنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ وہ عوام کو اپنا مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہیں اور عوام یہ باور کر لیں کہ ملک میں روشن ضمیر صرف ایک ہی ذات ہے اور اس کے مقابلے میں ہر دوسری شخصیت خائن، غدار، ملک و قوم کی دشمن اور فہم و تدبر سے عاری ہے۔ اس کا اثر صاف ظاہر ہے کہ قوم ہر طرف سے مایوس ہو کر صرف ایک شخصیت کے گرد جمع ہو جاتی ہے۔

بلاشبہ وقتی طور پر آمریت کو اس کا بہت فائدہ پہنچتا ہے مگر اس خود غرضانہ اور عاقبت نااندیشانہ طرزِ عمل سے قوم میں قیادت کا خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ پوری قوم قیادت کے اعتبار سے بالکل بانجھ بن کر رہ جاتی ہے۔ اور صاحبِ اقتدار کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے جب اس کے گرد پھیلے ہوئے طلسمات ٹوٹتے ہیں تو عوام پر شدید قنوطیت اور مایوسی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ذہنی اور جذباتی اعتبار سے محرومی کے ایک ایسے افسوس ناک مقام پر پاتی ہے جیسے کوئی پیاسا مسافر پانی کی تلاش میں تپتے ہوئے صحرا کی طویل اور صبر آزما مسافت طے کرنے کے بعد آبلہ پا پہنچے اور وہاں اس پر یہ تلخ حقیقت اچانک آشکارا ہو کہ وہ مقام جو دُور سے اس کی نظروں کے سامنے اُبلتے ہوئے چشمے کا خوش کن منظر پیش کر رہا تھا وہ سراب تھا۔ اضمحلال، مایوسی اور ناامیدی کے اس عالم میں لوگ غلطی سے یہ فرض کر بیٹھتے ہیں کہ یہاں ہر جگہ دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔ یہاں خلوص کا کوئی ایک چشمہ بھی نہیں۔ یہاں جس طرف بھی نگاہ اٹھا کر دیکھا جائے مکر و فریب کے چمکتے ہوئے ذرات ہی پھیلے ہوئے ہیں۔ اُن کی قوم اخلاص و شرافت سے یکسر محروم ایک لق و دق صحرا ہے جس میں دُور دُور تک انسانی ہمدردی کا کوئی نخلستان نظر نہیں آتا۔ جب کسی قوم کے اندر اپنی قیادت کے بارے میں اس قسم کے

مایوس کن احساسات پیدا ہو جائیں تو پھر دنیا کی کوئی قوت اسے اضمحلال اور انتشار سے نہیں بچا سکتی۔ اس کے ہاں نفسانفسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ افراتفری کے عالم میں شترِ بے مہار کی طرح جس طرف چاہتی ہے بن بسری اور منہ زور ہو کر دوڑ پڑتی ہے۔

بدقسمتی سے اس وقت پاکستان اُن ساری بربادیوں کا بھیانک نقشہ پیش کر رہا ہے جو آمریت اپنے جلو میں لازمی طور پر لاتی ہے۔ اس ملک کو صرف ایک فرد کی جولانگاہ بنا کر باقی ہر اس فرد یا گروہ کو آمرانہ قوانین اور آرڈیننسوں کے ذریعے مشکیں کس کر بے بس بنا دیا گیا جو ملک کے اجتماعی معاملات میں کسی طرح بھی دخیل ہو سکتا تھا۔ ان حالات سے ہر طالع آزما نے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ زرداروں نے آمریت کی تائید اور حمایت سے ملکی دولت کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹا اور بالکل بے خوف ہو کر غریبوں پر ظلم ڈھائے اور محنت کشوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم کیا۔ سرکاری افسروں نے آمریت کے زیر سایہ اپنے آپ کو عوامی بازپرس سے یکسر محفوظ و مامون سمجھتے ہوئے کمزوروں پر عرصۂ حیات تنگ کیا اور خدا اور خلق سے بالکل بے نیاز ہو کر زندگی کے ہر شعبے میں فرعونیت کا ثبوت دیا۔ ہر سرکاری افسر اپنے حلقے اور اپنے دائرۂ اختیار میں اپنے آپ کو صدرِ مملکت سے کسی طرح بھی کم نہیں سمجھتا تھا اور جس طرح چاہتا تھا کمزوروں اور زیر دستوں کے حقوق پامال کرتا تھا۔ اسے اگر کوئی فکر لاحق تھی تو صرف یہ کہ وہ حکمراں جماعت کی نظروں سے گرنے نہ پائے۔ عوام اور ان کی فلاح و بہبود سے اسے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ آمریت کی حفاظت میں اس نے دھونس اور دھاندلی کا خوب مظاہرہ کیا۔ عوام کے حقوق کو بڑی بے دردی کے ساتھ پامال کیا۔ رشوت کی صورت میں خوب مال لوٹا اور اس ناجائز کمائی سے مسرفانہ اور عیش پرستانہ زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالی اور بڑی بے خوفی اور جسارت کے ساتھ بے بسوں اور مظلوموں کو اپنی ستم رانیوں کا تختۂ مشق بنایا۔ اخبارات میں آئے دن اس کے جور و جفا کی جو وحشت ناک داستانیں منظرِ عام پر آتی رہی ہیں ان میں سے بعض تو ایسی لرزہ خیز اور بھیانک ہیں کہ اگر انہیں درندوں کی طرف بھی منسوب کیا جائے تو وہ بھی ندامت کے مارے اپنی آنکھیں جھکا لیں اور یہ کہہ کر اپنی برادت کا اظہار کریں کہ ہم گو درندے ہیں مگر سفاکی میں اس حد تک نہیں جا سکتے جس حد تک کہ خدا اور خلق سے بے خوف ہو کر انسان جاتا ہے۔ کھاریاں میں ایک کم عمر معصوم بچی کو عوام کی جان و مال کے محافظوں نے جس ہوسناکی کا نشانہ بنا کر موت کے

گھاٹ اُتار دینا انسانیت کی ایک نہایت ہی دلفگار داستان ہے۔ اس پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے اسی قدر کم ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک واقعہ نہیں۔ اس سے پہلے کئی ایک واقعات اور اس کے بعد بھی چند دنوں میں اس قسم کے کئی ایک اور حادثات منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اور یہ تو وہ واقعات ہیں جن کا کسی طرح پتہ چل گیا ہے۔ یہاں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں رُوح فرسا واقعات ہوتے رہتے ہیں مگر انہیں با اختیار نوکر شاہی بڑی آسانی کے ساتھ دبا لیتی ہے اور عوام کے کانوں میں ان کی بھنک تک پڑنے نہیں پاتی۔ اس بیوروکریسی کی اس سے زیادہ سنگدلی اور بے رحمی کیا ہوسکتی ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہوکر معصوم بچوں کو گولی کا نشانہ بنایا جائے اور پھر اپنی اس سفاکی کو چھپانے کے لیے اُن کے ماں باپ کو اُن کی لاشیں بھی نہ دی جائیں۔ وہ بے چارے اپنے ہاتھ سے ان کی تجہیز و تکفین کرنے اور نمازِ جنازہ ادا کرنے سے بھی محروم رہتے ہیں۔ اس قسم کا سنگدلانہ عمل وہی لوگ اختیار کرسکتے ہیں جو انسانی جذبات سے یکسر عاری ہونے کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے محاسبے سے اپنے آپ کو محفوظ خیال کریں۔

ایسے انسانیت کُش ماحول کے خلاف عوام کے اندر ردِ عمل پیدا ہونا بالکل فطری امر ہے۔ لیکن ملک میں قیادت کا جو خلا پیدا ہوچکا ہے اور ایک قابلِ اعتماد متبادل قیادت کا جو فقدان رونما ہوچکا ہے اس کی وجہ سے یہ ردِ عمل مشکل ہی سے کوئی تعمیری رُخ اختیار کرسکتا ہے۔ لوگوں کے اندر آمریت کی جکڑ بندیوں کے خلاف شدید جوش اور ہیجان موجود ہے۔ وہ مستقبل کی تعمیر کسی نئے نقشے کے مطابق کرنے کے انتہائی آرزومند نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی آرزو کی متاعِ گم گشتہ کو ڈھونڈنے کے لیے بے حد فکر مند ہیں اور اس کے لیے سخت تگ و دو بھی کر رہے ہیں مگر نہ ان کی کوئی ایک جماعت ہے جس کی تنظیم سے وہ وابستہ ہوں اور نہ کوئی ایک معتمد علیہ رہنما ہے جس کے کہنے پر وہ چلیں اور اپنی منزلِ مقصود کی طرف کامیابی کے ساتھ بڑھ سکیں۔

اگر اجتماعی سرگرمیوں پر اس قسم کی ناروا پابندیاں عائد نہ کی گئی ہوتیں تو آج ہماری سیاسی زندگی میں یہ مہیب خلا نظر نہ آتا، جس کی وجہ سے ہماری ساری قوم اس وقت ایک بن سری فوج بن کر رہ گئی ہے۔ کسی سیاسی جماعت کی تشکیل بچوں کا کھیل نہیں ہے جسے ریت کے گھروندے کی طرح آناً فاناً بنا بھی دیا جائے اور جب ذرا دل بھر جائے تو اسے گرا بھی دیا جائے۔

عوام کے اندر سیاسی شعور بیدار کرنا اور انہیں اپنی قوتوں کو منظم طریقے سے کسی تعمیری کام پر لگانے کی تربیت دینا بڑا صبر آزما اور جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس کے لیے طویل محنت اور لمبی ریاضت کی ضرورت ہے۔ یہ کام کبھی افراتفری کے عالم میں اچانک سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ کچھ باصلاحیت اور ایثار پیشہ افراد، جنہیں انسانیت سے سچی ہمدردی اور قومی معاملات کی سمجھ بوجھ ہو آگے بڑھیں اور قوم کے سامنے خیر اور بھلائی کا پروگرام پیش کریں۔ جن لوگوں کو ان کی دعوت میں کشش محسوس ہو اور جنہیں ان کے طریقِ کار سے اتفاق ہو اور وہ اس دعوت کے لیے قربانیاں دینے پر بھی آمادہ ہوں وہ ایک منظم صورت میں اس مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کریں۔ اس اجتماعی نظم کی پابندی اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے سے لوگوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت ہوتی ہے۔ اور انہیں حوصلہ مندی، جرأت اور تدبر کے ساتھ ملکی مسائل حل کرنے اور قومی معاملات کو سلجھانے کا سلیقہ آتا ہے۔

اس تربیت کے فقدان کے مضر اثرات آج پوری طرح ہمارے سامنے ہیں۔ اہلِ پاکستان کی اکثریت ایسے افراد پر مشتمل ہے جن کا کسی سیاسی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں اور جو سیاسی تنظیمیں ملک میں موجود ہیں ان میں سے صرف دو ایک کو چھوڑ کر نہ تو کوئی پروگرام رکھتی ہیں اور نہ ان کے وابستگان کا کوئی ملک گیر حلقہ ہے۔ ایک وقتی اور ہنگامی ضرورت کے تحت چند افراد مل کر اپنی ایک الگ سیاسی ٹولی بنا لیتے ہیں۔ پھر چونکہ انہیں کسی اجتماعی جدوجہد کا ڈھنگ نہیں آتا اس لیے وہ من مانی کارروائیاں کرتے رہتے ہیں۔ انہیں قطعاً اس بات کا شعور اور احساس نہیں ہوتا کہ کسی جماعت سے وابستگی سے ان پر کیا فرائض اور کونسی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو کسی ڈسپلن کا پابند نہیں سمجھتے۔ جو بات ذہن میں آجائے اسے سوچے سمجھے اور پارٹی پروگرام کی روشنی میں غور کیے بغیر اچھالنا شروع کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک ایک جماعت کے اندر کئی کئی ٹولیاں جنم لیتی ہیں۔ پھر نہ صرف ہر ٹولی اپنا الگ راگ الاپتی ہے بلکہ اس کا ہر فرد بھانت بھانت کی بولیاں بولتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے اس ملک میں کتنے لاتعداد سیاسی محاذ قائم ہو چکے ہیں اور مسلسل قائم ہو رہے ہیں۔ اور ان پر جو لوگ سینہ تان کر کھڑے ہیں ان کے اندر کس نوعیت کے شدید اختلافات پائے جاتے ہیں اگرچہ یہ سب لوگ ایک ہی قوت یعنی آمریت کے خلاف صف آرا ہیں مگر مناسب تربیت اور صحیح تنظیم نہ ہونے کی وجہ سے انہیں ابھی تک یہ سلیقہ نہیں آیا کہ وسیع تر مفاد کے حصول کی خاطر کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہو کر منزلِ مقصود

کی طرف بڑھا جا سکتا ہے۔ اسلام سے محبت اور عقیدت کا دم بھرنے والوں میں وہ فکری ہم آہنگی نظر نہیں آتی جس کی جائز طور پر توقع کی جا سکتی ہے۔ بہت سے گروہ خالص اسلام کے علمبردار ہیں، مگر وہ متحد و متفق نہیں۔ اور ایک گروہ اسلام کا علمبردار بھی ہے اور اشتراکیت کا دم بھی بھرتا ہے۔ پھر بہت سے گروہ سوشلزم کا نعرہ بلند کر رہے ہیں مگر ان میں بھی اشتراکیت کی کسی ایک تعبیر پر اتفاق نہیں ہے۔ ان کے اندر بھی کئی ایک گروہ اور طبقات موجود ہیں۔ ایک گروہ اس ملک میں اشتراکیت کا روسی ایڈیشن لانا چاہتا ہے اور دوسرا چینی، اور تیسرا کسی نرالی اشتراکیت کا وکیل ہے جس کا کوئی واضح نقشہ وہ پیش نہیں کرتا۔ پھر اشتراکیت لانے کے لیے بھی ہر گروہ مختلف راستوں کی نشاندہی کر رہا ہے۔ ایک جبر و تشدد اور آمریت کے ذریعہ یہاں سُرخ انقلاب برپا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور دوسرا جمہوری طریق سے اشتراکیت کو یہاں کا غالب نظام بنانے کا آرزومند ہے۔ الغرض ہر فرد اور ہر گروہ اپنا ایک الگ نظریہ اور پروگرام رکھتا ہے اور سیاسی جماعتوں سے وابستگی کے باوجود اسے اس بات کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ اپنے سامنے کونسا پروگرام اور کونسا راستہ رکھتا ہے۔ اس خلفشار کی اصل وجہ محض آمریت کا وہ تسلط ہے جس نے صحت مند طریقے سے عوام کو سیاسی جماعتوں میں منظم ہونے اور آزادی سے کام کرنے کے مواقع سے محروم کر رکھا تھا۔ اس نے عوام کو عملاً یہ تربیت دی تھی کہ ملک اور اس کے معاملات سے بے فکر ہو کر بس اپنی تن پروری کی فکر میں لگے رہو۔ اور اگر مادی مفادات کا حصول چاہتے ہو تو حکمراں پارٹی کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ۔ اور جب اس کی جگہ کسی دوسری پارٹی کی طرف عنانِ اقتدار منتقل ہوتی نظر آئے تو فوراً اپنا قبلہ بدل ڈالو۔

جب کسی ملک میں آمریت طویل عرصہ تک مسلط رہتی ہے تو عوام کے اندر یک جماعتی سٹیٹ کا رُجحان قدرتی طور پر پرورش پاتا ہے۔ لوگ عام طور پر برسرِ اقتدار جماعت سے وابستہ رہنے ہی میں عافیت اور مصلحت سمجھتے ہیں مگر اس وابستگی میں انہیں ایثار و قربانی کی تربیت نہیں ملتی بلکہ خود غرضی اور بے ضمیری کے ساتھ زندہ رہنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم اپنی آغوش میں باہمت اور مخلص افراد پالنے کی بجائے بے ضمیر اور طالع آزما افراد کی پرورش کرتی ہے جنہیں سوائے اپنے ذاتی مفاد کے دنیا کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہ لوگ حالات کے تیور دیکھ کر صبح و شام اپنی وفاداریاں بدلتے رہتے ہیں۔ قومی نقطۂ نظر سے یہ اتنا بڑا زیاں ہے جن کا اندازہ نہیں

کیا جاسکتا ۔ اگر اقتدار کو عوامی خواہشات کے مطابق تبدیل کرنے کا جمہوری راستہ کھلا رہے اور سیاسی پارٹیوں کو اپنے آپ کو منظم کرنے اور عوام کے اندر اپنے خیالات پھیلانے اور رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی آزادی حاصل ہو تو پھر بے ضمیر افراد اور سستی شہرت چاہنے والوں کو پنپنے کے بہت کم مواقع میسّر آتے ہیں۔ کسی جماعت سے افراد کی مخلصانہ وابستگی اور جماعتی مقاصد کے لیے ان کے ایثار و قربانی، اور ان کی سیرت و کردار سے اُن کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور عوام کے لیے یہ جاننا کچھ مشکل نہیں رہتا کہ ملک کے اجتماعی معاملات کو چلانے کے لیے مختلف جماعتوں میں سے کون سی جماعت زیادہ قابلِ اعتماد ہے اور کس گروہ قول و عمل میں مخلص سمجھ سکتے ہیں۔ اسی طرح جب مختلف جماعتیں قوم کے اندر عوامی پیمانے پر کام کریں تو لوگوں کے لیے یہ اندازہ کرنا بھی مشکل نہیں رہتا کہ کس کے تدبّر اور کارکردگی پر وہ بھروسا کر سکتے ہیں۔

صدرِ مملکت کے تازہ اعلان کے بعد اب ملک میں ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں جن میں اقتدار عوامی نمائندوں کی طرف پُرامن جمہوری طریقے سے منتقل ہو سکتا ہے۔ اس حالت میں جو لوگ تشدّد کے راستے ہی سے انقلاب لانے پر مصر ہوں ان کو نیک نیت اور ملک کا خیر خواہ نہیں مانا جاسکتا۔ ان کی یہ روش خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس ملک کا آئندہ نظام ملک کے باشندوں کی آزاد مرضی سے طے کرانا نہیں چاہتے بلکہ مار دھاڑ کے ذریعے سے اپنی مرضی پوری قوم پر زبردستی مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جسے کسی طرح بھی صدر ایوب کی آمریت سے مختلف قرار نہیں دیا جاسکتا، اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ پاکستان کے لوگ ایک آمریت کی جگہ دوسری آمریت کے قیام کو برداشت کریں۔ اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ عوام کے ذہنوں میں یہ بات ذہن نشین کرائی جائے کہ جو لوگ جبر اور تشدّد کے ذریعہ اُن پر مسلط ہونے کے مذموم ارادے رکھتے ہیں وہ عوامی خواہشات کا کبھی احترام نہیں کر سکتے۔ جبر و تشدّد جمہوریت کا نہیں آمریت کا مؤثر ہتھیار ہے اور اس سے ہمیشہ رائے عامہ کو کچلنے اور عوام پر چند لوگوں کی مرضی ٹھونسنے کا کام ہی لیا جاتا رہا ہے۔ آمریت کے جلو میں ہمیشہ وہ نظام آیا کرتا ہے جسے عوام اگر ابتداءً دھوکا کھا کر قبول کر بھی لیں تو آخر کار اُس کے بُرے نتائج دیکھ کر اُس سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ کوئی نظام جو عوامی خواہشات اور آرزوؤں کا مظہر اور ترجمان ہو اسے تشدّد اور مار دھاڑ سے مسلط کرنے کی نہ کوشش کی جاتی ہے اور

نہ ایسی کوشش کی کبھی ضرورت ہی پیش آتی ہے۔ عوام کی عظیم اکثریت ترغیب ہی سے اس کی افادیت کی قائل ہوتی ہے اور اس کے حق میں اپنا فیصلہ دے دیتی ہے۔ تشدد کے ذریعہ سے آنے والا انقلاب پہلے تار وھاڑ سے مسلط ہوتا ہے اور پھر ملک پر قابض ہونے کے بعد پولیس اور فوج کے ذریعہ سے عوام کو دبا کر رکھتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حیاتِ انسانی میں سختی کا بھی ایک مقام ہے۔ بعض اوقات فی الحقیقت ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن میں کچھ نہ کچھ سختی سے کام لیے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں ہوتا لیکن انسانی زندگی کے طویل تجربات کی روشنی میں اس حقیقت کو کوئی عقل کا اندھا ہی جھٹلا سکتا ہے کہ افکار و نظریات کے اندر تبدیلی لائے بغیر کسی صحت مند، پائیدار اور ہمہ گیر انقلاب کی راہ ہموار نہیں ہو سکتی۔ معاشرتی، سیاسی اور معاشی تغیرات درحقیقت انسان کے قلب و دماغ کی تبدیلی کے عکس ہیں اور قلب و دماغ کی اقلیم ایک ایسی کشور ہے جو تشدد کے تسلط سے ہمیشہ آزاد ہوتی ہے بلکہ تشدد کا ہر حربہ اس کے اندر نفرت و حقارت کا زبردست ہیجان پیدا کرتا ہے۔ تاریخِ انسانی اس حقیقت پر شاہد ہے کہ آج تک دنیا میں جتنے بھی پائیدار اور ہمہ گیر انقلابات آئے وہ سارے انسان کے فکر و نظر کے زاویوں میں تبدیلی کا نتیجہ تھے اور ان کے مقابلے میں جو اکھاڑ پچھاڑ وقتی جوش اور ہنگاموں کی وجہ سے عمل میں آئی اس کے اثرات نقش بر آب ثابت ہوئے اور تباہی و بربادی کے روح فرسا اور بھیانک مناظر کے سوا اس کی کوئی یادباقی نہ رہی۔ قتل و غارت کے ذریعہ سے عوام کی گردنوں کو جھکایا جا سکتا ہے مگر دلوں کو نہیں جھکایا جا سکتا۔ بلکہ گردن تشدد اور دباؤ سے جس قدر جھکنے پر مجبور کی جاتی ہے اُسی نسبت سے دل بغاوت پر آمادہ ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتا ہے کہ جلد ہی اسے نفرت و حقارت کے اظہار کا کوئی موقع میسر آئے۔

دُور نہ جائیے صرف اپنے ملک میں اکتوبر کے انقلاب کو دیکھیے کہ یہ اپنی مضبوط گرفت اور غیر معمولی قوت و طاقت کے باوجود کس قدر ناکام ثابت ہُوا ہے۔ ایک شخص جسے عوام نے ملک کے دفاع کا کام سپرد کر رکھا تھا دفعۃً اٹھا اور عوام کے سارے حقوق پامال کرتے ہوئے فوج کے بل بوتے پر تختِ اقتدار پر متمکن ہو گیا۔ اس کے بعد اس شخص نے اپنے دل پسند افکار و نظریات کو قومی دولت کے صرف سے پھیلانا شروع کیا اور جن جن تدابیر کو اپنی عقل کے مطابق

مناسب اور موزوں سمجھا انہیں جبر کے ساتھ عمل میں لایا۔ پھر اپنی شخصیت کو عوام کی نظر میں محبوب و مقبول بنانے کے لیے ہر طرح کے جتن کیے اور ہر دوسری آواز کو بلند ہونے سے روک دیا۔ مگر کسی معاملے میں بھی اسے کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ لوگوں نے نہ تو اس کے پروگراموں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور نہ اس کی ذات کے ساتھ محبت و عقیدت کے گہرے جذبات وابستہ کیے۔ عوام کے اندر اس شخص کے افکار کی کیا حیثیت ہے اور ان کے دلوں میں اُس کا فی الحقیقت کس قدر احترام ہے اس کا اندازہ کچھ تو اسے ہو گیا ہے لیکن اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہو گا جب وہ اقتدار کے اس بلند مقام سے اُتر کر عوام کی سطح پر آکر کھڑا ہو گا۔

ہمارے ملک کے ہر سوچنے سمجھنے والے فرد کو اس تجربہ کی ناکامی اور اس کے اسباب پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ اس نوعیت کے تجربات کا آخر ہر جگہ یہی حشر کیوں ہوتا ہے۔ ہمارے اس دور میں خود مسلمان ملکوں کے اندر یہ تجربہ مصر، شام، عراق، انڈونیشیا، ترکی اور بہت سے دوسرے ممالک میں ہوا ہے۔ غیر مسلم ممالک میں بھی ہنگری، پولینڈ، مشرقی جرمنی، چیکوسلواکیا اور برما میں اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ سب جگہ اس کے نہایت عبرت ناک نتائج سامنے آئے ہیں۔ جبر اور تشدد نے حکومت کے ایوان تو متزلزل کیے۔ حکومت کرنے والے ہاتھوں میں بھی تبدیلی پیدا کی۔ مگر کسی ایک جگہ بھی یہ تشدد حکمران جماعت کے افکار کو عوام کے دل و دماغ میں نہ اتار سکا۔ یہ بات انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ جب بھی کوئی خارجی چیز یلغار کر کے اس کی طرف بڑھتی ہے تو وہ ذہنی اور جسمانی دونوں اعتبار سے اپنے آپ کو اس کی مدافعت کے لیے تیار کرتا ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ وہ اس یلغار کی لپیٹ میں آکر ہمت ہار بیٹھے لیکن اس کا دماغ کبھی اسے دل و جان سے اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اسے شدید مجبوری سمجھ کر وقتی طور پر گوارا کرتا ہے۔ یہی حال افکار و نظریات کا ہے۔ جن تصورات کو اندھے بہرے جوش کے ساتھ بدست اقتدار کی پشت پر سوار کر کے حملہ کرنے پر اُبھارا جاتا ہے وہ ایک مرتبہ پوری فضا میں شدید ہلچل پیدا کر دیتے ہیں اور سطح بین لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کے جسم و روح دونوں پر ان کا مستقل تسلط قائم ہو گیا ہے۔ مگر جلد ہی اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے والوں پر یہ تلخ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ یہ تسلط جسے وہ لافانی سمجھتے تھے تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہے۔

اس نوعیت کے سطحی اور غیر فطری انقلابات کے عبرتناک نتائج سے ہماری آنکھیں اب پوری طرح کھل جانی چاہییں اور ہمارے اندر اگر واقعی ملک و ملت کی محبت موجود ہے اور ہم اخلاص کے ساتھ اس کی خیر خواہی چاہتے ہیں تو ہمیں پوری دیانتداری کے ساتھ اس امر کا فیصلہ کر لینا چاہیے کہ ہم قوم کو آگ کے اس کھیل سے ہمیشہ محفوظ رکھنے کی کوشش کریں گے اور کبھی کوئی ایسی راہ اختیار نہ کریں گے جس سے اجتماعی امور کے فیصلے رائے کے بجائے بندوق کی گولی سے کیے جائیں۔ یہ راہ بڑی تباہ کن ہے۔ جب کوئی قوم ایک مرتبہ اس پر چل پڑتی ہے تو پھر سوائے بربادی کے اور کوئی چیز اس کے حصے میں نہیں آتی۔ اس گولی نے لاتعداد قوموں کو تباہ کیا ہے۔ خدارا اسے اس ارضِ پاک میں انسانی خون کی چاٹ نہ ڈالیے، کیونکہ اگر اسے ایک مرتبہ اس کی چاٹ لگ گئی تو پھر کسی فرد کا خون اس کی ہوس سے محفوظ نہ ہوگا۔

اگر اصول اور انصاف کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس ملک میں کسی فرد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اسلام کے علاوہ کسی دوسرے نظریۂ حیات کے نفاذ پر اصرار کرے۔ یہ ملک جن لاتعداد معصوم جانوں کے خون سے بنا ہے ان سب نے اسلام اور صرف اسلام کی خاطر یہ قربانیاں دی تھیں۔ ان کی پاکیزہ روحیں یہ خبر سننے کے لیے گوش بر آواز ہیں کہ جس مقدس مقصد کے لیے انہوں نے جان و مال اور عزت و آبرو لٹائی وہ پورا ہو گیا ہے۔ خدارا ان مقدس روحوں کو تڑپا کر خدا کے عذاب کو دعوت نہ دیجیے کیونکہ مظلوم کی پکار اور اس کی دستگیری کرنے والی بلند و بالا ذات کے درمیان کوئی دوسری چیز حائل نہیں ہوتی۔

اگر بالفرض تمہارے دل ان پاک طینت مظلوموں کی مظلومیت کے احساس سے خالی ہو چکے ہیں اور تم یہ بات یکسر بھول چکے ہو کہ یہ قوم خدا سے کس وعدے کے ساتھ اس ملک کی طلبگار ہوئی تھی تو اس حال میں بھی کم از کم اس کے باشندوں پر اتنا رحم تو ضرور کرو کہ انہیں جبر و تشدد کی تعلیم دے کر آگ کے سمندر کی طرف نہ دھکیلو۔ اگر تمہیں اسلام کے سوا کچھ دوسرے نظریات عزیز ہیں تو انہیں لوگوں کے سامنے کھل کر پیش کرو، دلائل سے ان کی برتری ثابت کرو اور اگر عوام کی اکثریت تمہارے ساتھ متفق ہو کر تمہیں عنانِ اقتدار دینے پر آمادہ ہو جائے

تو پھر یہ ذمہ داری سنبھالو۔ اس ایک معقول اور سیدھے راستہ کے علاوہ ہر دوسرا راستہ بربادی کا راستہ ہے صرف اسی رستے میں تمہاری اور پوری قوم کی فلاح کا راز مضمر ہے۔ خدا کرے کہ جوش و خروش کی اس فضا میں تشدد کے المناک نتائج ہماری قوم کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائیں۔

ہماری زندگی کا اخلاقی اور دینی معیار کس قدر پست ہو چکا ہے اور مال و دولت کی اندھی محبّت نے ہمیں شرافت کے لطیف احساسات سے کس قدر بیگانہ بنا دیا ہے اس کا ہلکا سا اندازہ پاک و ہند کے معروف دینی اور ادبی جریدے "معارف" کے مندرجہ ذیل نوٹ سے لگایا جا سکتا ہے:

"گذشتہ مہینہ لکھا جا چکا ہے کہ پاکستان کے ناشرین نے دار المصنّفین کی کتابیں چھاپ لی ہیں۔ اب یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض ناشر سیرۃ النبی کا پُرراسٹ چھاپنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ پاکستان کی بدولت یُوں ہی ہندوستان کے اسلامی ادارے نیم جان ہو رہے ہیں۔ اب اس کے خود غرض ناشران کو بالکل ہی ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اگر دار المصنفین کی کتابیں اس طرح پاکستان میں چھپتی رہیں تو اس کے زندہ رہنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اگر حکومت پاکستان تک ہماری آواز پہنچ سکتی ہے تو ہماری درخواست ہے کہ وہ ان ناشروں کو اس خود غرضی سے روکنے کی کوشش کرے عرصہ ہوا ایک ناشر نے سیرۃ النبیؐ کا پہلا حصہ چھاپ لیا تھا۔ اُس زمانہ میں سردار عبد الرب نشتر زندہ تھے، انہوں نے اس تاجر کو روکا اور پاکستانی پریس نے اس کے خلاف اتنا لکھا کہ وہ مطبوعہ کتابیں دار المصنفین کے حوالہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔"

اس ملک میں اگر اخلاقی حس کا بالکل ہی جنازہ نہیں نکل چکا تو ہمیں امید کرنی چاہیے کہ ہر وہ فرد یا ادارہ جو اس ظلم اور زیادتی کو روکنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے وہ ضرور اس کی کوشش کریگا اور جو لوگ اس قسم کی دھاندلیاں کر رہے ہیں یا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ان سے اس قدر سختی سے باز پُرس کریگا کہ آئندہ کبھی انہیں اس شرمناک کاروبار کی جسارت نہ ہو گی ہم حکومت سے اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس معاملہ میں پُوری دلچسپی لے گی اور بھارت کے ایک قدیم علمی و دینی ادارے کو اس ظلم و ستم سے بچانے کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کرے گی۔